تنقید و تبصرہ

مسلمانانِ ہند و پاکستان کی تاریخِ تعلیم

زیرِ نظر کتاب کے مصنف سیفیہ کالج بھوپال کے وائس پرنسپل پروفیسر سید نوشہ علی ہیں۔ "پیش لفظ" پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر سید معین الحق نے لکھا ہے اور کتاب میں جہاں جہاں "حواشی و تعلیقات" کی ضرورت تھی، وہ مفتی انتظام اللہ شہابی نے پوری کردی ہے۔ گو مصنف اس مفید اور اہم موضوع کا پورا احاطہ نہیں کرسکے جس کا کہ موصوف نے خود اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے، اس لئے پروفیسر نوشہ علی کی یہ علمی کوشش ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے اور یقیناً علمی حلقے اس کا خیر مقدم کریں گے۔

"پیش لفظ" میں بالکل صحیح لکھا گیا ہے کہ "اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جس میں انسان کی روحانی اور دنیوی زندگی کے ہر پہلو کی فلاح و بہبود کے لئے ہدایت موجود ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں روحانیت اور لادینیت کا وہ فرق جو یورپ کے مذہبی تصورات میں اس قدر نمایاں نظر آتا ہے، موجود نہیں۔ اس لئے تعلیم میں دین کا عنصر شامل ہونے سے اس کے تصورات میں نہ تنگ نظری کا خطرہ ہے اور نہ تنگیٔ میدان کا۔ اس نظامِ تعلیم سے جس کی بنیاد دینی تصورات اور عوامل پر رکھی گئی ہے عظیم المرتبت مفکر، فلسفی، سائنس داں، ادیب اور شاعر پیدا ہوئے۔ جن کی تحقیقات کسی نہج سے دینی نہیں کہی جاسکتیں"

اسلامی تاریخ کا وہ دور جب کہ تعلیم میں دین کا عنصر شامل تھا، اور اس کے باوجود اس کے تصورات میں نہ تنگ نظری تھی اور نہ تنگیٔ میدان، واقعہ یہ ہے کہ علمی و ذہنی لحاظ سے مسلمانوں کا بہترین دور تھا۔ اس دور میں ایک تو دینی اور

دنیوی علوم میں اس طرح تفریق نہیں کی جاتی تھی، جیسی بعد کے دور میں، جسے دورِ زوال کہنا چاہیئے "کی جانے لگی۔ اس دور میں ہر دینی علم دنیوی بھی تھا۔ اور ہر دنیوی علم دینی بھی۔ اور یہ کہ "اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے" اس کی علمی تعبیر یوں ہوتی تھی۔ اور اسلام کو حقیقتاً "حسنۃ فی الدنیا" اور "حسنۃ فی الآخرۃ" کا حامل اور جامع سمجھا جاتا تھا اس دور میں اس زمانے کے جو بھی معلوم مروج علوم تھے سب ایک ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔ اور ان کی تحصیل کے بعد ایک آدمی "عالم دین" بھی ہوتا تھا، اور "سول سرونٹ" بھی۔ دوسرے اس دور میں جب کہ دینی اور دنیوی علوم کی موجودہ تفریق نہیں تھی، علمی و ذہنی لحاظ سے بڑی آزادی تھی اور بعد میں ہمارے ہاں تصورات میں جو تنگ نظری اور تنگ میدانی پیدا ہوئی وہ اس وقت نہیں تھی۔ دینی اور دنیوی علوم کو ایک جگہ پڑھانے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ اس سے ذہن آزاد رہتا ہے۔ طلبہ اور اہل علم کے سامنے ہر قسم کے موضوع آتے رہتے ہیں اور ان کا زاویۂ نگاہ محدود نہیں ہوتا۔

مثال کے طور سے امام غزالی کو لیجیے۔ ان کے فکر کی جدت، عظمت اور اجتہاد و خلاقی تمام تر رہین منت تھی اُس دور کے بغداد کی، جس کی اس وقت مولانا شبلی کے الفاظ میں علمی و تعلیمی فضا یہ تھی:۔ "بغداد دنیا بھر کے عقائد و خیالات کا دنگل تھا۔ اس زمین پر قدم رکھ کر ہر شخص پورا آزاد ہو جاتا تھا۔ اور جو کچھ چاہتا تھا کہہ سکتا تھا۔" پیش لفظ میں مشہور مسلمان فلسفیوں الکندی، فارابی، ابن رشد، ابن سینا۔ اور البیرونی کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے فلسفہ و سائنس کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ ڈاکٹر معین الحق کے الفاظ میں یہ اسی نظم تعلیم کا حاصل تھے جس میں دین کا عنصر شامل ہونے کے باوجود تصورات کی تنگ نظری کا خطرہ تھا نہ تنگ میدانی کا۔ افسوس یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اس نظم تعلیم کی جڑیں زیادہ نہ جم سکیں اور ہمارے ہاں سے اس بلند پائے کے فلسفی پیدا نہ ہو سکے مصنف کتاب اس ضمن میں لکھتے ہیں:۔ "عام خیال لوگوں کا یہ ہے کہ ہندوستان نے اعلیٰ درجے کے علماء پیدا نہیں کئے۔ ہندوستانی مفکر بغداد، دمشق و قرطبہ کے علماء کی تقلید کرتے رہے۔ ہندوستان نے کوئی بلند پایہ عالم پیدا نہیں کیا۔" موصوف کے نزدیک "اس اعتراض کو دور کرنے میں بہت دشواریاں ہوں گی۔۔۔ اس میں ہندوستان اور دوسرے اسلامی ممالک کی درس گاہوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔" بہر حال یہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان نے بوعلی سینا، غزالی اور ابن رشد پیدا نہیں کئے، مگر ان علماء کو ہندوستان میں کتب درسیہ کی شکل میں لانا اور ان کی تعلیم کو

زندہ رکھنا یہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ خاص طور پر جب کہ ملک کی زبان عربی فارسی نہ ہو“

یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ابتدا میں ایرانیوں نے دین اسلام کے ساتھ ساتھ عربی زبان بھی قبول کی اور اس میں نظم و نثر اور دوسرے علوم کے لازوال آثار چھوڑے، پھر انہوں نے عربی زبان ترک کر کے اپنی زبان فارسی کو زندہ کیا اور اس میں بھی عربی کی طرح اعلیٰ پائے کی علمی تخلیقات کیں، لیکن اس کے برعکس ہندپاکستان میں تقریباً ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی، لیکن انہوں نے یہاں ایسی علمی یادگاریں نہ چھوڑیں کہ ان کی تاریخ تعلیم زیر نظر کتاب سے بہتر لکھی جا سکتی۔ مصنف کو اس کتاب کی ترتیب میں بڑی جانکاہی کرنی پڑی ہے۔ کیونکہ بقول ان کے ”مفید مطلب واقعات مسلسل اور یکجا نہیں مل سکے۔ یہ تاریخی میدان میں بکھرے ہوئے موتی ہیں، جن کو ایک لڑی میں پرونا آسان کام نہیں ہے اس طرح بعض مرتبہ ایک بہت مفید مطلب کتاب کو چند شکوک کی بنا پر نظر انداز کرنا پڑا۔ اور سیکڑوں صفحات پڑھنے کے بعد چند سطور مفید مطلب نظر آئیں۔“

ہندوستان میں لتنے طویل اسلامی عہد میں عراق، ایران، خراسان مصر و شام اور اسپین کی طرح اعلیٰ پائے کے کیوں فلسفی و مفکر پیدا نہ ہوئے یہ موضوع اس قابل ہے کہ اس پر تحقیق ہو اور اس کے وجوہ معلوم کئے جائیں کہ آخر کیوں برصغیر کے ذہین اور دانشور غیر مسلم طبقوں نے بالعموم اس طرح اسلام اور اسلامی تہذیب کو نہ اپنایا جس طرح مثال کے طور سے ایرانیوں نے اپنایا تھا، نیز اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود اسلامی علوم کی جڑیں اس سرزمین میں زیادہ کیوں نہ پھیلیں۔ یہ علوم اسلامی ’ہندی‘ کیوں نہ ہوئے اور ہمارے اہل علم و فکر کی نظریں ہمیشہ شمال کی طرف سے آنے والے علماء کی طرف کیوں لگی رہیں کیا یہ تکلیف وہ بات نہیں کہ مسلمانان ہند و پاکستان کی تاریخ تعلیم کے مصنف کو یہ لکھنا پڑا کہ اگرچہ ہندوستان نے بوعلی سینا غزالی اور ابن رشد پیدا نہیں کئے، لیکن اس کے علماء کا یہی کارنامہ بہت بڑا ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو درس میں شامل کیا اور اس طرح انہیں زندہ رکھا۔

زیر نظر کتاب کے مصنف نے زیادہ تر دہلی اور وسطِ ہند کی تعلیمی سرگرمیوں تک اپنی بحث کو محدود رکھا ہے اس میں سندھ، پنجاب اور مشرقی پاکستان کی تعلیمی زندگی کا کوئی ذکر نہیں، ضرورت ہے کہ کوئی صاحب اس کمی کو پورا کریں اور ان اطراف کی تاریخ تعلیم بھی مرتب کر دیں، خاص طور سے سندھ کی اس نوع کی

تاریخ لکھنا زیادہ مشکل نہیں، کیونکہ اس کے لئے کافی سے زیادہ مواد موجود ہے، اور سندھی علماء کا سلسلہ شروع سے آخر تک ملتا ہے۔

کراچی کی سلمان اکیڈمی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، اور پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرف سے کچھ عرصے سے بڑی اچھی اور مفید کتابیں شائع ہو رہی ہیں جو علمی بھی ہیں اور تحقیقی بھی۔ اور جن سے اس نئی مملکت میں صحیح معنوں میں علمی و فکری زندگی پیدا کرنے میں مدد مل سکتی ہے یہ کتاب سلمان اکیڈمی نے شائع کی ہے۔ اور ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی ۵ سے مل سکتی ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ ضخامت ۳۲۵ صفحے اور قیمت ۷۵-۶ روپے ہے۔

طباعت اور کتابت زیادہ اچھی نہیں، کتابت کی بعض غلطیاں کافی تکلیف دہ ہیں ایک علمی و تحقیقی کتاب کی اشاعت پر زیادہ توجہ ہونی چاہیئے تھی۔

تاریخ شیر شاہی

از عباس خاں سروانی

مترجم۔ مظہر علی خاں

ہندوستان کے مشہور پٹھان بادشاہ شیر شاہ سوری کی اس تاریخ کے مصنف عباس خاں سروانی پٹھان تھے اور شیر شاہ کے خاندان سے ان کی قرابت تھی خود اکبر اعظم نے جس کے باپ ہمایوں کو شیر شاہ نے پے درپے شکستیں دے کر ہندوستان سے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا، مصنف کو ہدایت کی کہ وہ شیر شاہ کی تاریخ لکھے۔ ڈاکٹر سید معین الحق مقدمہ کتاب میں لکھتے ہیں: "تاریخ شیر شاہی شیر شاہ کی پہلی تاریخ ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی وفات کے پینتیس چالیس سال بعد لکھی گئی اس وقت تک بعض وہ لوگ بقید حیات تھے، جنہوں نے شیر شاہ کی فتوحات یا نظام سلطنت میں حصہ لیا تھا، ایسے لوگ بھی کافی تعداد میں موجود تھے، جو اس عہد کے واقعات کی چشم دید گواہی دے سکتے تھے۔ عباس خاں نے ان ہی کے بیانات اور شہادت پر اپنی تاریخ تیار کی ... عباس خاں نے واقعات اور معلومات کی فراہمی میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے۔ کتاب کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عباس خاں بہت بڑا ادیب نہ تھا۔ لہذا عبارت آرائی کے ذریعہ اس نے واقعات کی شکل بدلتے یا ان کو کسی خاص رنگ میں پیش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی"

یہ اکبر کی شخصی عظمت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ وہ ایک پٹھان مورخ کو ایک ایسے پٹھان بادشاہ کی